ڈاکٹر فریحہ نگہت

خدیجہ عمر گورنمنٹ کالج برائے خواتین ٹینچ بھاٹہ راولپنڈی

اردو افسانے میں مابعد الطبیعیاتی عناصر کا اجمالی جائزہ

Dr Fareeha Nighat

Khadija Umar Government College for Women, Tench Bhatta, Rawalpindi

Metaphysical Elements in Urdu Short Stories: An Short Review

Metaphysical elements have been fascinating Urdu short story writers since its evolution. This article covers different facets of metaphysical elements of prominent Urdu short story writers starting from 1901 todate with evolving trends of creation of universe, concept of time and space, romanticism, mysticism, Hindi, Greek and Islamic mythologies in the backdrops of scientific, philosophical and religious interpretations.

انسان ہمیشہ سے وجود اور کائنات کے بارے میں غور و فکر کرتا آیا ہے۔ فلسفہ ہو، سائنس ہو یا ادب مابعد الطبیعیاتی فکر ہر ایک میں کارفرما رہی ہے کیونکہ یہ ایک ایسا علم ہے جو کائنات میں مظاہر کے پیچھے چھپی ہوئی حقیقت کو دریافت کرتا ہے۔ دیگر شعبہ ہائے زندگی کی طرح علم و ادب پر بھی مابعد الطبیعیات نے گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔ اردو شاعری میں مابعد الطبیعیات کے موضوع کو بڑی اہمیت حاصل رہی ہے۔ میر، درد، غالب اور اقبال کی شاعری میں مابعد الطبیعیاتی موضوعات نظر آتے ہیں۔ اسی طرح نثر میں بھی مابعد الطبیعیات پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ غرض اردو شعر و ادب کی کوئی بھی صنف ہو ان میں مابعد الطبیعیاتی فکر و رجحانات ہمیشہ غالب رہے ہیں۔ اردو افسانے میں بھی آغاز سے اب تک مابعد الطبیعیاتی عناصر کسی نہ کسی صورت موجود رہے ہیں۔ ۱۹۳۶ء میں جب افسانہ نگاری کو فروغ ملا تو اس دور میں لکھے جانے والے افسانوں پر چونکہ داستان کا اثر تھا اس لیے مابعد الطبیعیاتی عناصر بھی افسانے میں موجود تھے۔ ۱۹۰۱ء سے ۱۹۳۶ء تک کا دور اردو افسانے کا دور اولین اس لیے اہم ترین دور ہے کہ اس میں دیگر اصناف ادب کی طرح افسانہ بھی ارتقائی مراحل طے کر رہا تھا۔ نئے رجحانات کے ساتھ مابعد الطبیعیاتی عناصر بھی افسانے میں در آئے تھے۔ نئے نئے اسالیب متعارف ہوئے، موضوعی اور معنوی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ تکنیک میں بھی تنوع پیدا ہوا۔ تخلیقی ادب چاہے وہ کسی عہد اور ماحول میں پیدا ہو اس کی ایک داخلی سطح بھی ہوتی ہے اس لیے کہ تخلیق کار باطن کی نگاہ سے ہر چیز کا مطالعہ کرتا ہے اور اس کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ انسان اور سماج کو بھی قانون فطرت کے پیمانے پر جانچے اور کائنات میں انسان کے مقام کو سمجھنے کی کوشش کرے۔ اردو افسانہ نگاری کے دور اولین میں دو قسم کے ملے جلے رجحانات دکھائی دیتے ہیں یعنی ایک پریم چند کی

حقیقت نگاری اور دوسرا یلدرم کی رومانویت۔حقیقت نگاری کی سمت الگ تھی لیکن رومانویت کے ڈانڈے بالآخر مابعدالطبیعیات کے ساتھ ملتے تھے۔ان دونوں افسانہ نگاروں کی تقلید کے زاویے الگ الگ سمتوں میں اپنے اپنے سفر پر گامزن رہے۔اس عہد میں رومانویت کے زیر اثر پروان چڑھنے والے افسانے میں رومانوی وتخیلی رویہ، داستانوی انداز، مافوق الفطرت واقعات، محبت کا ماورائی انداز، عشق کا افلاطونی نظریہ، پراسراریت، ماورائیت، اساطیر، دیومالا، روحانیات کے مسائل، ضعیف الاعتقادی، جن، دیو، پری کے اذکار، بھگتی، آواگون وتناسخ کے فلسفے اور کہیں کہیں علامت کے استعمال کے اولین نقوش، مابعدالطبیعیاتی عناصر کے طور پر نظر آتے ہیں۔اس عہد کے افسانہ نگاروں میں راشد الخیری، سلطان حیدر جوش اور پریم چند کے ہاں مابعدالطبیعیاتی عناصر کے ابتدائی نقوش ملتے ہیں جب کہ سجاد حیدر یلدرم، نیاز فتح پوری، مجنوں گورکھپوری، حجاب امتیاز علی اور مسز عبدالقادر کے ہاں یہ عناصر بڑے واضح طور پر دکھائی دیتے ہیں۔اس دور کے افسانہ نگاروں نے تخیلی او رومانوی انداز اپنایا اور عشق میں افلاطونی نظریے کی عکاسی کی اس لیے ان کے ہاں ارضی مظاہر کے ساتھ مضبوط ربط نہیں تھا بلکہ انسانی قدروں کو علامتوں سے ظاہر کرنے کی کوشش نظر آتی ہے۔اس کے ساتھ ساتھ افسانے میں داستانوی عناصر کا در آنا بھی ایک قدرتی امر تھا کیونکہ اردو میں جب افسانے کے سفر کا آغاز ہوا تو اس وقت ہمارے ہاں کہانی کا پس منظر داستان سے آیا تھا اگرچہ تکنیک اور ہیئت مغرب سے مستعار لی گئی تھی اس لیے یہ کہنا بجا ہوگا کہ اردو افسانے کی روح میں ایک ماورائی عنصر پہلے سے موجود تھا جس کا اظہار پریم چند کے ابتدائی افسانوں میں دیکھا جاسکتا ہے۔اس عہد میں انداز بیان پر تخیل کا غلبہ رہا اور فطرت سے دلچسپی کے باعث مناظر فطرت بیان کرنے پر مکمل عبور نظر آتا ہے۔

دور اوّلین کے افسانہ نگاروں میں مابعدالطبیعیاتی عناصر کے ابتدائی نقوش ہمیں پریم چند کے ہاں دکھائی دیتے ہیں۔پریم چند اگرچہ سماجی افسانہ نگار تھے لیکن داستانوی اسلوب کو اختیار کرنے کی وجہ اس روایت کے ساتھ جڑنا بھی تھا جو ماورائی رجحان کی حامل تھی۔پریم چند جب مکمل طور پر خارجیت کی طرف مائل ہوئے تو پھر یہ ماورائیت غائب ہوگئی لیکن آج بھی جب ہم ان کے شہرہ آفاق افسانے 'کفن' کا ذکر کرتے ہیں تو ہمیں اس افسانے کے کردار انسان کی اس دوسری سطح کی طرف لے جاتے ہیں جو عام طور پر سماج کے پردے پر دکھائی نہیں دیتی۔ اس طرح ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ پریم چند کا افسانہ 'دنیا کا سب سے انمول رتن' اردو ادب میں مابعدالطبیعیاتی طرز کا پہلا افسانہ ہے۔اس میں 'حضرت خضر' کا ذکر اور ان کی جانب سے غیبی امداد کا احوال ملتا ہے کیونکہ اس افسانے میں پریم چند نے حضرت خضر کی علامت استعمال کی ہے۔ ان کے دیگر کئی افسانوں 'مٹھ'، 'ناگ پوجا'، 'منتر' اور 'کایا کلپ' میں بھی مابعدالطبیعیاتی عناصر ملتے ہیں۔

ابتدائی عہد کے افسانہ نگاروں میں یلدرم اس لحاظ سے منفرد افسانہ نگار ہیں کہ ان کے ہاں رومان کے ذریعے مابعدالطبیعیاتی عناصر نمایاں ہوکر سامنے آئے ہیں۔درحقیقت اردو میں رومانوی دبستان کا یلدرم ہی سے آغاز ہوتا ہے۔انہوں نے پہلی بار ارضی حقیقتوں سے منہ موڑ کر تخیلی انداز اپنایا۔وہ رومانویت کے علمبردار تھے اس لیے ان کے افسانوں میں رومانی وتخیلی انداز مابعدالطبیعیاتی عناصر کے طور پر ابھرتا دکھائی دیتا ہے۔اس کے علاوہ ان کے ہاں ترکی کے مطالعہ کی بنا پر ترکی، یونانی اور انگریزی اساطیر بھی ملتی ہیں۔'خارستان وگلستان' اس سلسلے میں ان کا نمائندہ افسانہ ہے۔اس افسانے میں انہوں نے 'سفید براق' کی اسطورہ استعمال کی ہے، یہاں یلدرم یونانی اساطیر سے کام لیتے ہیں۔ان کی رومانویت کی بنیاد عورت اور رومان پر ہے۔ان کے زیادہ تر افسانوں کے موضوعات عورت اور محبت کے گرد گھومتے ہیں مگر ان کے ہاں محبت ایک ماورائی صورت اختیار کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔علامتوں کا استعمال بھی یلدرم کے ہاں مابعدالطبیعیاتی عناصر کی صورت میں ملتا ہے۔ 'سودائے سنگین' میں پہلی بار علامتوں کا شعوری احساس ابھرتا ہے جہاں دیواروں پر سرخ کاغذ، آدھی زمین میں دھنسی ہوئی عورت علامتی صورت

اختیار کرتی ہے۔ یہی انداز افسانہ 'حکایۂ لیلیٰ و مجنوں' میں بھی ہے۔ اس افسانے میں یلدرم نے حال کے واقعات بیان کرنے کے لیے لیلیٰ مجنوں کو علامت بنایا ہے نیز لیلیٰ مجنوں کا دوسرا جنم آواگون وتناسخ کی طرف اولین اشارے کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ 'حضرت دل کی سوانح عمری' میں اساطیری علامتیں موجود ہیں کیونکہ جونہی دل کے معاملات پر بات ہوتی ہے تو خیال اچانک 'کیوپڈ و سائیکی' کی یونانی اساطیر کی جانب مڑ جاتا ہے۔ افسانے میں یلدرم نے یونانی اساطیر سے مابعدالطبیعیاتی عناصر پیدا کیے ہیں۔ 'صحبت ناجنس' میں ذہنی و نفسی معاملات بیان کیے ہیں۔ 'چڑیا چڑے کی کہانی' ایشیائی اساطیر کا درجہ رکھتی ہے۔

نیاز فتح پوری یونانی اساطیر پر افسانوں کی بنیاد رکھتے ہیں۔ روحانیات کے موضوعات بھی ان کے افسانوں میں اہم ہیں۔ 'کیوپڈ و سائیکی' نیاز کے افسانوں میں نمائندہ افسانے کا درجہ رکھتا ہے۔ یہ افسانہ یونانی اساطیر کی تخلیق مکرر (Retold) ہے۔ نیاز کے افسانے یونانی صنمیاتی ماحول اور فضا کی اہم مثال ہیں۔ ان کے افسانوں میں دیوی، دیوتاؤں، جن، پری اور عفریت جیسے اذکار ملتے ہیں۔ افسانہ 'سیاہ بلی' بھی فضا اور ماحول کے لحاظ سے مابعدالطبیعیاتی عناصر لیے ہوئے ہے۔ ان کے دیگر افسانوں میں 'بھوتوں کا شہر'، 'فاطمہ'، 'ایک شاعر کا انجام'، 'شہاب کی سرگزشت' اہم ہیں۔ نیاز کے ہاں یونانی و لاطینی اساطیر، دیومالا، تخیلی و ماورائی انداز، قدیم مذہبی و روایتی نظریات، اوہام پرستی اور ضعیف الاعتقادی مابعدالطبیعیاتی عناصر کے طور پر ملتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں محبت ایک ماورائی جذبے اور عورت ایک غیر مرئی روپ میں نظر آتی ہے۔ 'کیوپڈ و سائیکی' یونانی اساطیر کی خوب صورت مثال ہے۔

مجنوں گورکھپوری نے اردو افسانہ نگاری کے اس دور میں جنم لیا جب ایک طرف تو رومانویت پروان چڑھ رہی تھی اور دوسری طرف مافوق الفطرت اور پراسرار افسانہ نگاری کا رجحان عام تھا۔ مجنوں کے افسانے روحانیات کے موضوعات پر مشتمل ہیں۔ عالم ارواح کے واقعات اور ان کا بیان ان کے افسانوں میں مابعدالطبیعیاتی عناصر پیدا کرتا ہے۔ 'سمن پوش' ان کا نمائندہ افسانہ ہے۔ ان کے افسانوں میں مسئلہ آواگون، تناسخ اور مکتی کے اثرات نمایاں ہیں۔ یہی فلسفے ان کے افسانوں کی بنیاد بنتے ہیں۔ 'محبت کا جوگ'، 'تم میرے ہو'، 'حسن شاہ' اور 'سبز پری' ان کے اہم افسانے ہیں۔ مجنوں گورکھپوری کے علاوہ حجاب امتیاز علی اور مسز عبدالقادر نے بھی اسی نہج پر افسانے لکھے ہیں۔ ڈاکٹر فردوس انور قاضی مابعدالطبیعیاتی میلان رکھنے والے افسانوں کے بارے میں لکھتی ہیں:

> اردو افسانہ نگاری میں ایک دور ایسا بھی آیا جس میں پراسرار اور ہیبت ناک افسانوں کا رواج ہو گیا۔ ان افسانوں میں فوق الفطرت کرداروں کی شمولیت اور عجیب و غریب غیر فطری واقعات انسان کے ذہنی فرار کی کیفیت کی نشاندہی کرتے ہیں... یہ افسانے بھی حقیقت اور فریب کی درمیانی کڑیوں کے اعتبار سے دلچسپ ہیں۔ اسی قسم کے افسانوں میں اہم نام مجنوں گورکھپوری کا ہے۔ اس طرح کے افسانے 'سمن پوش' میں مل جاتے ہیں۔ ان کے علاوہ حجاب امتیاز علی نے بھی ایسے افسانے لکھے جن میں ہیبت ناک اور پراسرار عناصر موجود ہیں۔ (۱)

حجاب امتیاز علی کے افسانوں کی فضا تخیلی و ماورائی ہے۔ وہ پراسرار اور دہشت ناک واقعات کو بڑے انوکھے انداز میں بیان کرتی ہیں۔ حجاب کے افسانوں میں خواب اور رومان، اوہام پرستی، ضعیف الاعتقادی، عالم ارواح کے واقعات اور تخیل مابعدالطبیعیاتی جہات پیدا کرتے ہیں۔ وہ اپنے افسانوں کی بنت میں شیاطین، لاشوں، روحوں اور بدروحوں سے خوف و تحیر پیدا کرتی ہیں۔ حجاب کے افسانوں میں 'کالی

حویلی'، 'نواب الیاس کی موت'، 'لاش'، 'شیطان' اور دیگر کئی مابعدالطبیعیاتی عناصر کے حامل افسانے ہیں۔ 'صنوبر کے سایے' رومانوی انداز کا افسانہ ہے۔ حجاب کے افسانوں کو خواب اور رومان کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

دور اولین میں سب سے زیادہ مابعدالطبیعیاتی عناصر کے حامل افسانے لکھنے والوں میں مسز عبدالقادر کا نام اہم ہے۔ ان کے افسانے خوفناک، ہیبت ناک اور پراسرار ہیں۔ انہوں نے مکتی اور آواگون کے فلسفوں سے افسانوں کی بنت کی ہے۔ ان کے افسانوں میں اوہام پرستی اور ضعیف الاعتقادی نمایاں ہیں۔ ان کے اہم افسانوں میں 'معلم کا راز'، 'بالائے ناگہاں'، 'گلنار'، 'وادی قاف'، 'راہبہ' اور 'ارواح خبیثہ' اہم ہیں۔ ان کے افسانوں میں روحوں کا بیان، عالم ارواح کے واقعات، مافوق الفطرت واقعات، روحوں کا انتقام، جانوروں کا انتقام، جن، دیو، پریوں کے اذکار مابعدالطبیعیاتی عناصر کے طور پر نظر آتے ہیں۔ رومانوی دبستان میں مابعدالطبیعیاتی عناصر سے کام لینے والے افسانہ نگاروں نے ہندی اساطیر، یونانی متھالوجی اور دیگر پراسرار عوامل سے کام لیا اور اس طرح انسانی ذات اور کائنات کے تاریک گوشوں تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کی۔ مختصراً اردو افسانے کا ابتدائی و ارتقائی دور ہے جس میں نئے رجحانات سامنے آئے، نئے اسالیب قائم ہوئے اور افسانہ بتدریج اپنی ترقی کی منازل طے کرتا رہا۔

اردو افسانے کا دوسرا دور جسے افسانہ نگاری کا دور زریں بھی کہا جاتا ہے، ۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۷ء تک کا دور ہے۔ اس عہد میں ترقی پسند تحریک کے زیر اثر اردو افسانہ نگاری میں بلحاظ موضوع، ہیئت، فلسفوں اور نظریات میں بے پناہ تبدیلیاں آئیں جن کے تحت اردو افسانے میں نئی جہات متعین ہوئیں اور نئے رجحانات کی طرف قدم بڑھانے کے عمل کا آغاز ہوا۔ ترقی پسندی کے اس عہد میں اگرچہ غالب رجحانات نفسیاتی و جنسی تھے لیکن اس کے ساتھ ساتھ مابعدالطبیعیاتی فکر کو بھی افسانہ نگاروں نے اپنا موضوع بنایا۔ ترقی پسند تحریک کے زور پکڑتے ہی رومانویت کا رویہ کمزور ہوگیا۔ مارکسی فلسفے کے متعارف ہونے سے سماجی انصاف اور سیاسی انقلاب کی باتیں ہونے لگیں۔ کچلے ہوئے مظلوم طبقات اور ان کے مسائل کو موضوع بنایا جانے لگا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ترقی پسند نقادوں کے نزدیک انسانی ذات اور اس کے بطون کے اندر چھپی ہوئی پوشیدہ دنیا کی اہمیت نہیں تھی اور وہ کائنات میں انسان کے مقام کے بجائے صرف سماج میں آدمی کی مادی ضروریات کو مقدم سمجھتے تھے۔ اس طرح ہمارے ہاں ایک فارمولا افسانہ بھی وجود میں آیا لیکن جب ہم اس عہد زریں کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں ایسے افسانوں اور افسانہ نگاروں کی تعداد کہیں زیادہ دکھائی دیتی ہے جنہوں نے انسانی مابعدالطبیعیات اور کائنات کی الوہی شکلوں کو بھی اپنے افسانے کا حصہ بنایا۔ اس عہد کے افسانے پر جن چیزوں کے اثرات مرتب ہوئے ان میں جوائس اور پروست کا پیش کردہ نفسیاتی فن، شعور کی رو کا نظریہ اور کردار نگاری کا ایک نفسیاتی طریقہ، لارنس کی دکھائی ہوئی وہ زندگی جس میں جنسی تسکین کی جستجو اہم ہے، ورجینا وولف کی مادی زندگی کے خلاف بغاوت کا نظریہ، بکسلے کا منطقی اور فلسفیانہ انداز بیان، چیخوف کا انسانی محبت کا جذبہ، فرائیڈ کی جنسی نفسیات کے تحت شعور، لاشعور اور اجتماعی لاشعور کے نظریات، کارل مارکس کا معاشی نظریہ وغیرہ شامل ہیں۔ انہی اثرات کے تحت کارل مارکس نے مادی جدلیات کا نظریہ پیش کیا اور روح پر مادے کو فوقیت دی۔

ترقی پسند تحریک نے قدیم، شکستہ اور غلامانہ سوچوں کو ختم کر کے ادب کو نئی نہج عطا کی۔ پہلی جنگ عظیم اور روسی انقلاب نے ہر شے کی طرح زبان و ادب پر بھی گہرے اثرات مرتب کیے اور ہندوستان کے ادیبوں نے بھی ترقی پسند تحریک کا خیر مقدم کیا۔ ترقی پسند تحریک کے زیر اثر اردو افسانے میں بڑی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ اس کے تحت تین طرح کے رجحانات اردو افسانے میں نظر آئے یعنی سماجی حقیقت نگاری

کار جحان، انقلابی رومانی حقیقت نگاری کا رجحان اور بے باک حقیقت نگاری کا رجحان۔ ان رجحانات کے ساتھ ساتھ موضوعات، تکنیک اور اسالیب میں بھی متنوع تجربات کیے گئے۔

افسانہ نگاری کے اس عہد میں کارل مارکس کے فلسفے کے ساتھ ساتھ فرائیڈ اور یونگ کے نظریات کو بھی مقبولیت حاصل ہوئی جن کے تحت لاشعور اور اجتماعی لاشعور کے نقطہ نظر میں ذہن کی پراسراریت کو سمجھنے میں مدد ملی، اسطور کے ذریعے کائنات اور وجود کی نئی تفہیم کی گئی۔ سائنس کی دنیا میں ذہن کو ایک پراسرار شے سمجھا جاتا تھا۔ سگمنڈ فرائیڈ نے ذہن کے اس اسرار کو جاننے کے لیے تحلیل نفسی کے نظریات پیش کیے اور خواب، علامتیں اور خیال کے آزاد تلازمے جیسی اصطلاحات کے ذریعے ان نظریات کو ادب سے ملایا۔ فرائیڈین نفسیات کے زیر اثر افسانے میں دو طرح کے رجحانات در آئے۔ جن میں سے ایک فکری نوعیت کا جب کہ دوسرا تکنیکی نوعیت کا تھا۔ فکری حوالے سے جنس اور وجود کے ابہام کے ملے جلے رجحانات نے فروغ پایا اور تکنیکی حوالے سے آزاد تلازمہ خیال، شعور کی رو، داخلی خود کلامی، علامت نگاری اور تجریدیت نمایاں طور پر سامنے آئے۔ اس کے ساتھ ساتھ افسانے میں خواب، تخیل اور حقیقت کا امتزاج فروغ پانے لگا۔ مذہبی اساطیر افسانے میں در آئیں۔ کرداروں کی ذہنی کشمکش کو علامتوں کے ذریعے بیان کیا جانے لگا۔ کرداروں کے شعور اور لاشعور میں دبی خواہشات کو جاننے کے لیے خوابوں کے تحلیل و تجزیے کا انداز اپنایا گیا جس کے لیے شعور کی رو اور آزاد تلازمہ خیال کی تکنیکوں سے کام لیا گیا۔ اس عہد کے اہم افسانہ نگاروں میں سعادت حسن منٹو، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، احمد ندیم قاسمی، عصمت چغتائی، میرزا ادیب، ممتاز شیریں، محمد حسن عسکری اور قرۃ العین حیدر شامل ہیں۔

سعادت حسن منٹو کے افسانے میں مابعد الطبیعیاتی عناصر کے خال خال نقوش ملتے ہیں کیونکہ انہوں نے اسے ایک باضابطہ فکر کے طور پر نہیں اپنایا لیکن انہوں نے موجود اور غیر موجود، مجرد اور غیر مجرد اشیاء کو فنی چابکدستی سے ایک ہی سطح پر پیش کیا ہے۔ منٹو کے بیشتر افسانوں کا انجام تحیر، تجسس اور حیرت پر منتج ہوتا ہے جس سے افسانوں میں ایک قسم کی پراسراریت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس نہج پر لکھے گئے منٹو کے افسانوں میں 'سرکنڈوں کے پیچھے' اور 'اصلی جن' اہم ہیں۔

کرشن چندر اپنے عہد کے سب سے اہم ترقی پسند افسانہ نگار تھے جو طبقاتی امتیاز کے خلاف اپنے افسانے کا علم اٹھا کر چلتے رہے لیکن ان کا افسانہ ترقی پسند ہونے کے باوجود رومانوی مزاج کا حامل تھا۔ رومانویت کے علاوہ انہوں نے علامتی افسانے بھی لکھے یہ دونوں باتیں اس بات کا کھلا اظہار ہیں کہ ان کی نگاہ صرف خارج پر ہی نہیں تھی بلکہ انسان، سماج اور کائنات کے کسی دوسرے رخ کو بھی دریافت کرنا چاہتی تھی۔ رومانویت کے اس رنگ کے ساتھ ساتھ داستانوی انداز، اساطیر سے تخلیقی تعلق، تمثیلی، علامتی و تجریدی پیرایہ اظہار اور روحانیت ان کے افسانوں میں مابعد الطبیعیاتی جہات پیدا کرتی ہیں۔ ان کے افسانوں میں مخصوص طلسمی فضا ہے اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے کسی موضوع، کردار، منظر نامے یا فضا آفرینی کے تقاضے کے تحت علامتوں کا استعمال بھی کیا ہے۔ کرشن چندر کے افسانوں کے موضوعات میں مشینی زندگی کے مسائل، تہذیبی و معاشرتی مصائب، فسادات، جنگ و امن کشمیر اور شہری زندگی کی کشمکش، بچپن کی یادیں، فطرت اور جنس وغیرہ شامل ہیں۔ ان کے افسانوں میں 'غالیچہ'، 'ہوا کے بیٹے'، 'پرانے خدا'، 'گرجن کی ایک شام'، 'آدھے گھنٹے کا خدا'، 'ایک خوشبو اڑی اڑی' وغیرہ میں مابعد الطبیعیاتی عناصر کی جھلکیاں ملتی ہیں۔

راجندر سنگھ بیدی کے افسانوں میں ہندی دیومالا، علائم و اساطیر اور استعاراتی انداز، مابعد الطبیعیاتی عناصر کے طور پر ابھرتے

ہیں۔ بیدی کی مابعدالطبیعیاتی فکر سے تخلیقی تعلق کے پیچھے وہ تہذیبی عمل کارفرما ہے جس سے انہیں خاص دلچسپی تھی۔ دراصل بیدی اوپر کی سطح پر ترقی پسند رویے سے جب کہ باطنی سطح پر اساطیری مابعدالطبیعیات سے بھی جڑے ہوئے تھے جو بیدی کے فن میں علامتیت ورمزیت، تہہ داری اور دروبینی پیدا کرتی ہے۔ ترقی پسندی کے اس عہد میں جہاں ہر افسانہ نگار نفسیاتی رجحانات کے تحت تحلیل نفسی، شعور، لاشعور اور تحت الشعور کی بات کرتا دکھائی دیتا ہے وہاں بیدی کے ہاں بھی کرداروں کے نفسیاتی تجزیے کا غالب رجحان ملتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے مذہبی عقائد اور توہمات سے بھی افسانوں کی بنت کاری کی ہے۔ انہوں نے ازمنہ قدیم کی اساطیر کو نئے تہذیبی تناظر میں پیش کیا ہے۔ راجندر سنگھ بیدی کے افسانوں 'گرہن'، 'اپنے دکھ مجھے دے دو'، 'متھن'، 'ایک باپ بکاؤ ہے'، 'لاجونتی'، 'جوگیا'، 'یوکلپٹس' اور 'دیوالیہ' وغیرہ میں مابعدالطبیعیاتی عناصر موجود ہیں۔

عصمت چغتائی کے ابتدائی افسانوں میں رومانویت کا عنصر مابعدالطبیعیاتی جہات پیدا کرتا ہے۔ ترقی پسند تحریک کے تحت اگرچہ ان کے موضوعات میں تبدیلی آئی اور وہ عورت کی سماجی گھٹن، ان کی پیچیدگیوں اور اس کے نتیجے میں رونما ہونے والی جنسی کج رویوں کی نمائندہ افسانہ نگار کہلائیں مگر اس کے باوجود ان کے افسانوں کا رومانی وعلامتی انداز اور داستان گوئی کا روایتی آہنگ ان کے ہاں مابعدالطبیعیاتی لہریں پیدا کرتا رہا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے نفسیاتی رجحان کے زیر اثر عورتوں کے ذہنوں میں پنپنے والی نفسیاتی کشمکش کو بھی کہانی کے قالب میں ڈھالا ہے۔ عصمت چغتائی کے چند افسانوں 'ننھی کی نانی'، 'ہیرو'، 'روشن' اور 'ہاتھ' وغیرہ میں مابعدالطبیعیاتی رنگ نظر آتا ہے۔

احمد ندیم قاسمی کے افسانوں کا خمیر اگرچہ دیہاتی پس منظر سے اٹھا ہے مگر ان کے افسانوں کا پراسرار ماحول، رومان اور طلسمی فضا ان کے افسانوں میں مابعدالطبیعیاتی رنگ پیدا کرتی ہے۔ ان کے ہاں داستانوں کا سا انداز ملتا ہے جو ایک مخصوص قسم کی تحیر آمیز فضا پیدا کرتا ہے۔ احمد ندیم قاسمی کے افسانوں 'گڑیا'، 'چڑیل'، 'ماسی گل بانو'، 'فقیر سائیں کی کرامات' اور 'بھوت' وغیرہ میں مابعدالطبیعیاتی رنگ غالب ہے۔

میرزا ادیب کے ہاں مابعدالطبیعیاتی عناصر سے ایک تخلیقی تعلق کی صورت ملتی ہے۔ ان کے افسانوں میں تصوف، رومان، اساطیر، خوف ودہشت، جادو، پریوں، دیوتاؤں اور جنوں کی پراسراریت اور خواب وتخیل جیسے مابعدالطبیعیاتی عناصر ملتے ہیں۔ ان کی کہانیوں میں روحوں کو نکال کر بوتل میں بند کرنے سے لے کر دیوی، دیوتاؤں کی پوجا، جنوں اور دیوتاؤں کا قلب ماہیت سے انسان بن جانا جیسے واقعات ملتے ہیں۔ میرزا ادیب کے افسانوں کی دروں بینی، کشف اور تجسس ان میں دوہری معنویت اور تہہ داری پیدا کر کے انہیں آفاقی درجہ عطا کرتے ہیں۔ میرزا ادیب نے تخیل اور فینٹسی کی تخلیق کے ساتھ ساتھ برطانوی حکومت اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی گھٹن کو بھی موضوع بنایا ہے۔ انہوں نے انسانی جذبوں کی سچائی اور رشتوں کی عظمت پر قلم اٹھایا۔ میرزا ادیب کی ابتدائی رومانویت اور روحانیت پسندی آہستہ آہستہ حقیقت نگاری سے ہوتی ہوئی علامتی رنگ اختیار کر گئی۔ انہوں نے علامتی افسانے بھی لکھے، میرزا ادیب کے افسانوں میں 'مقدس درخت'، 'مورتی'، 'چاہ بابل'، 'ملکہ مصر'، 'نیلم پری'، 'اس کے ہاتھ'، 'یوسف زلیخا' اور 'درون تیرگی' میں مابعدالطبیعیاتی عناصر ملتے ہیں۔

ممتاز شیریں نے بھی کچھ ایسے افسانے لکھے ہیں جن میں اساطیر، دیومالا اور مذہبی تلمیحات، مابعدالطبیعیاتی جہات پیدا کرتی ہیں۔ انہوں نے ایرانی، یونانی، عجمی اور ہندی متھالوجی کے اثرات کو قبول کیا اور متھ کے ساتھ ساتھ داستانوی رنگ بھی اختیار کیا ان کے افسانوی مجموعے 'میگھ ملہار' میں زیادہ تر مابعدالطبیعیاتی موضوعات کے حامل افسانے ہیں۔ انہوں نے انسانی ذات اور تشخص سے متعلقہ موضوعات پر بھی قلم اٹھایا۔ انسانی ذہن کی پراسراریت کا کھوج لگانے کے لیے شعور، لاشعور، شعور ذات، نرگسیت، تحلیل نفسی اور شیزوفرینا جیسی نفسیاتی

اصطلاحات کو اردو افسانے میں برتنے کے نئے ڈھب متعارف کروائے۔ممتاز شیریں کے کچھ افسانوں 'آئینہ'، 'کفارہ'، 'میگھ ملہار' اور 'انگڑائی' میں مابعد الطبیعیاتی عناصر دیکھے جاسکتے ہیں۔

محمد حسن عسکری کے افسانے نفسیاتی کشمکش، فرد کی تنہائی کا احساس، جنسیت کے فطری اظہار، تحلیل نفسی، تاثر آفرینی، یاسیت اور تنہائی کے نئے تلازمات جیسے عناصر لیے ہوئے ہیں۔عسکری نے فرد اور کائنات کے رشتوں پر نہ صرف غور کیا بلکہ انہیں تخلیقی صورت عطا کی ہے ۔فرائیڈ اور یونگ کے نفسیاتی رجحانات کا سب سے زیادہ اثر عسکری کے ہاں دیکھا جاسکتا ہے۔عسکری کی مذہب اور تصوف کی جانب مراجعت ان کے افسانوں میں مابعد الطبیعیاتی لہریں پیدا کرتی ہے۔اس کے علاوہ فلسفہ وجودیت، سرائلزم، حقیقت نگاری، مارکسی نظریات کے اثرات بھی ان کے افسانوں پر دکھائی دیتے ہیں۔عسکری کے ہاں حال سے زیادہ ماضی کی یادوں میں گم رہنے کا رجحان ہے جو ان کے افسانوں میں ایک قسم کا ناسٹلجیا پیدا کرتا ہے۔عسکری نفسیاتی دبستان کے نمائندہ افسانہ نگار ہیں جنہوں نے کرداروں کے نفسی مطالعہ کو افسانے میں متعارف کروایا۔حسن عسکری کے افسانے 'حرام جادی'، 'قیامت ہمرکاب آئے نہ آئے'، 'چائے کی پیالی'، 'کالج سے گھر تک'، 'ایک معمولی خط' اور 'ذکر انوار' میں مابعد الطبیعیاتی عناصر دکھائی دیتے ہیں۔

قرۃ العین حیدر کے افسانوں میں تشخص کی بازیافت اور جڑوں کی تلاش اہم موضوعات ہیں۔ان کے ہاں تاریخیت ہے جس میں دیومالائی اسرار ہے یہ تاریخیت زمان ومکاں کی حد بندیوں سے آزاد ہے۔ان کے افسانوں میں پرانی تہذیبوں کی اساطیر، تاریخ وتہذیب، قصص و حکایات وملفوظات، وقت کے مابعد الطبیعیاتی تصورات، ناسٹلجیا، اسلامی متصوفانہ روایات، ہندی دیومالا، ماورائیت و اسراریت جیسے مابعد الطبیعیاتی عناصر ملتے ہیں۔انہوں نے وقت کو ماضی، حال اور مستقبل کے تسلسل میں بیان کیا ہے۔وقت اور فنا کے مسائل کے ساتھ ساتھ انسانی تاریخ کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ ان کے افسانوں میں ملتا ہے۔انہوں نے تصوف کی مربوط روایت سے بھی کہانیوں کی بنت کی ہے۔ اس کے علاوہ ماضی کی بازیافت کا عمل اور ایک مخصوص داستانوی رنگ ان کے افسانوں کا وصف خاص ہے۔وہ تاریخ میں انسانی وجود کی جڑیں تلاش کرتی ہیں اور ہجرت، بے وطنی، دو تہذیبوں کے ٹوٹنے، انسان کی ذہنی کشمکش اور انتشار کو الفاظ کے قالب میں ڈھالتی ہے۔قرۃ العین حیدر کے مابعد الطبیعیاتی طرز کے افسانوں میں 'ملفوظات حاجی گل بابا بیکتاشی'، 'سینٹ فلورا آف جارجیا'، 'روشنی کی رفتار'، 'قید خانے میں تلاطم ہے کہ ہند آتی ہے'، 'آئینہ فروش شہر کوراں'، 'یہ غازی یہ تیرے پراسرار بندے'، 'برف باری سے پہلے'، 'جہاں پھول کھلتے ہیں'، 'کیکٹس لینڈ' شامل ہیں۔

اردو افسانہ نگاری کا تیسرا دور ۱۹۴۷ء سے ۱۹۶۰ء کے عرصے پر محیط ہے۔اس دور میں اردو افسانے میں کافی تبدیلیاں رونما ہوئیں دیگر موضوعات کے ساتھ ساتھ مابعد الطبیعیاتی موضوعات بھی افسانے میں در آئے۔ جہاں فسادات، ہجرت، غم والم کی کیفیات، تہذیب سے بچھڑنے کا دکھ افسانے کا موضوع بنے وہاں نورومانوی رویے، متصوفانہ خیالات، علم الوجود کی اسراریت اور مابعد الطبیعیاتی نظریات بھی افسانے پر چھائے رہے۔اگرچہ کئی افسانہ نگار اس عہد میں بھی ترقی پسند تحریک کے تسلسل میں لکھ رہے تھے لیکن مجموعی طور پر اس دور میں نو رومانویت کی طرف غالب رجحان نظر آتا ہے۔اس کے علاوہ علم الوجود اور تصوف کی جانب رجحان بھی غالب رہا۔عشق کے سچے جذبے کو فروغ حاصل ہوا۔محبت ایک ماورائی قوت کے طور پر دکھائی دینے لگی اور محبت کا افلاطونی تصور افسانوں کا موضوع بنا۔فسادات کی خون ریزی کی کہانیوں کے ساتھ ساتھ ہیجان واضطراب اور جنسیت کی کیفیتیں بھی اس دور کے افسانے پر چھائی رہیں۔فسادات کے نتیجے میں جنم لینے والے المیے سے فرار کی یہی دو صورتیں سامنے آئیں کہ افسانہ نگاروں نے ایک طرف تو فطرت پسندی، عشق ومحبت اور رومانویت وماورائیت میں پناہ لی

اور دوسری جانب علم الوجود، صوفی ازم، تصوف اور روحانیت کی طرف رخ کر لیا۔ اسی بنا پر ان دونوں رجحانات کو اس عہد کے افسانے میں فروغ حاصل ہوا۔ نورومانویت کے اس عہد میں ایک قسم کے ناسٹلجیا کا رجحان بھی غالب رہا۔ ان افسانہ نگاروں نے ہجرت اور فسادات کے پس منظر میں اپنے افسانے لکھے جن میں ماضی پرستی کا رنگ چڑھا ہوا تھا۔ نورومانوی دور میں ایک اور رجحان نفسیاتی یا جنسی تجربے کا تھا۔ افسانہ نگاروں نے محبت بھری کہانیاں لکھیں اور اس رومان کے ساتھ ساتھ تحلیل نفسی، شعور، لاشعور اور تحت الشعور کی اصطلاحات کو نا صرف استعمال کیا بلکہ اپنے عمیق نفسیاتی مطالعہ کو بروئے کار لا کر کرداروں کی ذات سے لاشعور تک رسائی کی ممکنہ کوششوں سے افسانوں کو ایک نئی راہ دی۔ اس دور کے افسانہ نگاروں میں سے ممتاز مفتی، اشفاق احمد، بانو قدسیہ، اے حمید اور قدرت اللہ شہاب کے ہاں مابعد الطبیعیاتی عناصر موجود ہیں۔

ممتاز مفتی متصوفانہ رنگ کے افسانے لکھنے والوں میں ایک اہم نام ہے۔ ممتاز مفتی نے پچاس کی دہائی کے اوائل میں اگرچہ جنسی نفسیاتی نوعیت کے افسانے لکھے مگر بعد میں چل کر ان کا رجحان متصوفانہ موضوعات کی جانب ہو گیا۔ ممتاز مفتی کے افسانوں میں پراسراریت، ماورائیت، رومانویت، علامتیت اور تصوف کے ملے جلے رجحانات ملتے ہیں۔ ان کے ہاں ہندی دیومالائی اور داستانوی انداز، اساطیری ماحول، دیوی دیوتا کے اذکار اور مافوق الفطرت واقعات مابعد الطبیعیاتی رنگ پیدا کرتے ہیں۔ ممتاز مفتی کے مابعد الطبیعیاتی طرز کے افسانوں میں 'سندرتا کا راکھشس'، 'وہ'، 'ان پورنی'، 'کھل بندھنا'، 'الپسرا حویلی'، 'اَپ مین اَپ'، 'کرن محل کا بھوت'، 'بت، دیوتا اور سناٹا'، 'مینا کے پاؤں'، 'باجوؤں کی ڈھونڈ'، 'ہائڈ ہاؤس'، 'روغنی پتلے'، 'ایلینز'، 'گرداس'، 'داس گرو' اور 'راں ڑیاں' وغیرہ اہم ہیں۔

علم الوجود اور سچے جذبہ عشق کے پس منظر میں لکھنے والوں میں اشفاق احمد ایک بڑا نام ہیں جن کے ہاں عشق کا تصور بڑا منفرد ہے۔ وہ عشق کے افلاطونی تصور کے قائل ہیں جس میں ہوس نہیں بلکہ صرف سچی محبت کارفرما ہے۔ انہوں نے اپنے افسانوں میں خدا کی ذات کو تلاش کرنے کے رجحان کو متعارف کروایا جو ان کے ہاں تصوف کے جملہ پہلوؤں کی جانب مراجعت کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ ان کی مابعد الطبیعیاتی موضوعات سے خاص دلچسپی ان کے افسانوں میں واضح طور پر دکھائی دیتی ہے۔ اس ضمن میں ان کے افسانے 'حقیقت نیوش'، 'مانوس اجنبی'، 'ایل ویرا'، 'قصہ نل دمینتی'، 'بیا جاناں' اور 'گڈریا' اہم گردانے جاتے ہیں۔

بانو قدسیہ نے بھی اپنے افسانوں میں مابعد الطبیعیاتی فکر کو موضوع بنایا ہے۔ وہ بھی محبت کے افلاطونی تصور کی قائل ہیں اور محبت میں سچے جذبے کو اہمیت دیتی ہیں۔ متصوفانہ خیالات، تصوف اور عشق کا عنصر ان کے ہاں بھی بدرجہ اتم موجود ہے۔ بانو قدسیہ کے مابعد الطبیعیاتی طرز کے افسانوں میں 'توجہ کی طالب'، 'خود شناس'، 'نیلوفر'، 'مراجعت'، 'بکری اور چرواہا'، 'جھکورا'، 'انتر ہوت اداسی'، 'امربیل'، 'یہ رشتہ و پیوند'، 'پابند'، 'سدا کا روگ' اور 'سامان شیون' اہم ہیں۔

یونانی، ہندی اور اسلامی اساطیر کو افسانوں میں برتنے کا رجحان بھی اس عہد میں نمایاں دکھائی دیتا ہے۔ اے حمید کے ہاں مخصوص ماحول ہے انہوں نے محبت کے حوالے سے ماورائی کہانیاں لکھیں۔ اے حمید کی کہانیاں رومانوی ماحول سازی اور فضا بندی میں اپنی مثال آپ ہیں۔ ان کے افسانوں میں محبت کی معصومیت اپنی چاشنی کا رنگ دکھاتی ہے۔ اکثر و بیشتر یونانی اور ہندی اساطیر سے کام لیتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں اکثر رنگون کا ماحول، سری لنکا کی چائے اور چٹاگانگ کے پہاڑوں کا ذکر ملتا ہے جو رومانوی فضا تخلیق کرتا ہے۔ علاوہ ازیں اے حمید کے افسانوں میں ڈرائنگ روم کا ماحول ہے ایرانی قالین اور آتش دان ہیں، برفانی ہوا چل رہی ہے دھند ہے جو پوری فضا پر سحر طاری کر دیتی ہے۔ اے حمید کے افسانوں میں تحیر، سحر انگیزی اور ہوشربا واقعات مابعد الطبیعیاتی جہات پیدا کرتے ہیں۔ ان کے اس نوع کے افسانوں

میں، 'پراسرار لڑکی'، 'کچھ یادیں کچھ آنسو'، 'سردی''، بارش اور رات'، 'اے راوی کے پانی'، 'راون کے دیس میں' وغیرہ اہم ہیں۔

قدرت اللہ شہاب کے ہاں بھی مابعد الطبیعیاتی رنگ نمایاں رہا ہے۔ انہوں نے محبت، رومان اور تصوف کے مختلف زاویوں کو اپنے افسانوں میں جگہ دی۔ ان کے ہاں نفسیاتی اور جنسی گھٹن کے حوالے بھی ملتے ہیں۔ قدرت اللہ شہاب کے افسانوں 'ماں جی'، 'اور عائشہ آ گئی'، 'یا خدا'، 'چندراوتی'، 'صنم پلکیت'، '۱۸ سول لائن' وغیرہ اہم ہیں جن میں مابعد الطبیعیاتی رنگ غالب ہے۔

مجموعی حیثیت سے اس دور کے افسانہ نگاروں نے حال کی حقیقتوں کو کبھی ماضی کی خوابناک یادوں اور کبھی تخیلاتی و ماورائی خوش کن مناظر کے ساتھ ملا کر پیش کیا ہے۔ افسانوں میں کہیں کہیں وجدانی اور روحانی کیفیات پیدا کرنے کی کوششیں کی ہے۔ ذات کی شکستگی نے بعض افسانہ نگاروں کو محبت کے سچے جذبے اور تصوف کی جانب بھی مائل کر دیا۔ اس بنا پر اس عہد کے افسانہ نگاروں کے ہاں مابعد الطبیعیاتی عناصر کا در آنا لازمی امر تھا۔ ڈاکٹر شفیق انجم کے لفظوں میں:

> قدرت اللہ شہاب، اشفاق احمد، میرزا ادیب، غلام الثقلین نقوی اور اے حمید اس عہد کے ایسے رومانی افسانہ نگار ہیں جنہوں نے اپنے عہد کے آشوب کو رومان کے دھندلکوں میں دیکھا دکھایا اور محبت و جنس اور تصوف کے متنوع زاویوں کو اپنی کہانیوں میں جگہ دی۔ (۲)

نو رومانویت کے اس دور میں موضوعات کے علاوہ اسلوب میں بھی مابعد الطبیعیاتی رنگ غالب رہا۔ افسانہ نگار جذباتی تلاطم اور باطن میں چھپی ہوئی کیفیات کو سامنے لانے کے نت نئے پیرائیہ اظہار اختیار کرنے لگے۔ شعریت اور داستانوی رنگ غالب آ گیا۔ تحیر اور خوف کے جذبات ابھارنے کے لیے ماحول سازی اور فضا بندی کی جانے لگی۔ افسانوں کی فضا پر سحر طاری ہونے لگا اور حقیقت کی جگہ تخیل نے لے لی۔

اُردو افسانے میں نو رومانوی عہد کے فوراً بعد ۶۰ اور ۷۰ کی دہائی میں علامتی افسانہ نگاری عہدِ جدید کے غالب رجحان کے طور پر سامنے آئی۔ اس رجحان کے تحت موجودہ دور کے بعض افسانہ نگاروں نے مجموعی طور پر اپنے افسانوں میں علامت نگاری کو پروان چڑھایا۔ ایسے افسانوں کی بنت اشاروں اور کنایوں سے کی گئی۔ ان میں انفرادی و اجتماعی زندگی کے اسرار و رموز اور خیالات و جذبات کو علامتی پیرایہ میں ملفوف (camouflage) انداز میں پیش کیا جانے لگا جس سے قاری نہ سمجھنے کے باوجود بھی بہت کچھ سمجھنے لگا۔ یہ دور اُردو افسانے میں مابعد الطبیعیاتی عناصر کے حوالے سے بہت اہم ہے۔ اس دور میں جدید افسانے پر ایک نئی مابعد الطبیعیاتی فکر کی جھلکیاں غالب رہیں کیونکہ اس عہد کا ادیب سیاسی افراتفری اور جذباتی ہیجان سے گریز پا ہو کر رومانوی اور مابعد الطبیعیاتی فکر میں پناہ ڈھونڈنے لگا۔ دوسری جانب سائنس و ٹیکنالوجی کی بے حد ترقی نے بھی اذہان کو متاثر کیا۔ اس سائنسی ترقی کے باعث جب انسان کو بیٹھے بٹھائے سہولیات میسر آنے لگیں تو اسے اپنا وجود بے کار نظر آنے لگا۔ وہ اپنی ذات کے حصار میں مقید ہوتا چلا گیا۔ وجود کی شناخت اہم مسئلہ بن گئی، وجود اور کائنات کے متعلق تشکیک بڑھتی چلی گئی۔ جس سے وجود اور کائنات کے متعلق نئے نئے سوالات نے جنم لیا۔ وجودیت کی تحریک جو مغرب میں پنپ رہی تھی اب مشرق میں بھی زور پکڑ گئی اور انسان کائنات میں اپنے وجود اور حیثیت کو جاننے کے لیے مضطرب ہو گیا۔ اس طرح سارتر کے فلسفہ وجودیت کو فروغ ملا اور اُردو افسانہ بھی وجودیت کے اثرات سے بچ نہ سکا۔

مغرب میں وجودی فلاسفر سارتر، کامیو، رلکے، کافکا، دستوفسکی نے اپنی ادبی تخلیقات میں وجود کو جوہر پر فوقیت دی اور سارتر نے

ادب کو زندگی کا آئینہ کہنے کی بجائے اسے انسان کے وجود کو ثابت کرنے کا وسیلہ بتایا اور کہا کہ ادیب دراصل کرداروں کے اندر اپنے ہی وجود کو تلاش کرتا ہے۔ فلسفۂ وجودیت اور مغربی مفکّرین کے نظریات نے اُردو افسانہ کو بھی بے حد متاثر کیا۔ وجودیت کو اُردو افسانے نے صرف مغرب کی دین کے طور پر ہی قبول نہیں کیا بلکہ اس کو اپنانے میں یہاں کی سیاسی، سماجی معاشرتی صورت حال، فرد کی داخلیت و خارجیت اور ہر لحظہ بدلتی ہوئی کیفیات بھی معاون ثابت ہوئیں لہٰذا اردو افسانہ نگاروں نے وجودیت کے دینی اثرات کو قبول کیا اور لادینی اثرات سے گریز برتا۔ اردو افسانے میں وجودیت کے دیگر اثرات کے ساتھ ساتھ فلسفہ وحدت الوجود کے اثرات بھی نمایاں ہیں جس کے باعث وجودیت کے ڈانڈے مذہب سے بھی جا ملتے ہیں۔ اردو افسانہ نگاری کے اس عہد میں ترقی پسند تحریک کی وجہ سے خارجی حقیقت نگاری کا جو رجحان فروغ پا گیا تھا، اس کی جگہ داخلیت نے لے لی۔ داخلیت کے اس رجحان کے باعث کہانی میں ٹھوس واقعات کی جگہ خیال اور آئیڈیا کو اہمیت حاصل ہوئی، کردار سائے بن کر بے نام ہو گئے۔ نئی لسانی تشکیلات کا عمل، استعارہ سازی کا نیا تصور، علامت و تجرید موضوعات پر چھا گئیں۔ ہیئت و تکنیک کے نئے نئے تجربوں نے اردو افسانہ نگاری کے نئے زاویے متعین کیے اور اس قسم کے افسانے کو جسے جدید افسانہ کہا جاتا ہے، فروغ ملا۔

جدید افسانہ جسے عموماً علامتی و تجریدی افسانہ کہا جاتا ہے، علامتی افسانہ میں موجود معانی و مفاہیم کی دوہری سطحیں ہوتی ہیں جن میں ایک ظاہری اور دوسری باطنی ہے۔ باطنی سطح مخصوص علامتی نظام کے باعث تشکیل پاتی ہے۔ علامتی افسانہ کی اساس بالعموم کسی تلمیح، قدیم داستان یا مذہبی قصہ پر ہوتی ہے کبھی اس میں Myth سے بھی کام لیا جاتا ہے۔ علامتی افسانہ، دوہری معنویت کی ان باطنی و علامتی سطحوں کی بدولت مابعد الطبیعیات کے زمرے میں آتا ہے۔ اُردو ادب میں علامت نگاری فرانس کی علامتی تحریک سے در آئی۔ علامتی عمل مغرب کے علاوہ مشرق میں بھی کسی نہ کسی حوالے سے موجود رہا ہے۔ اساطیری ادب کے ساتھ ساتھ یہ لوک گیتوں، لوک کہانیوں، مغربی حکایات، سماجی رسوم و روایات میں بھی نظر آتا ہے۔ اُردو افسانے میں علائم کا استعمال اس کی مابعد الطبیعیاتی جہتوں کی ترجمانی کرتا ہے۔ علائم کے استعمال کے تین طریقے ملتے ہیں۔ پہلا یہ کہ آسمانی صحائف، اساطیر، لوک کہانیاں، حکایتیں اور داستانوں کے کچھ کرداروں کو نئی معنویت کے ساتھ موجودہ عہد کے ساتھ جوڑا جاتا ہے۔ دوسرا یہ کہ مظاہرِ فطرت کی اشیا کو علامتی شکل میں برتا جاتا ہے۔ تیسرا یہ کہ دورِ جدید کی بعض ایجادات کو علامتوں کی شکل میں پیش کیا جاتا ہے۔ علائم کا یہ استعمال افسانوں میں ابہام، رومانویت اور پُر اسراریت جیسے مابعد الطبیعیاتی عناصر پیدا کرتا ہے۔

افسانہ نگاری کے اس دور میں علامتی افسانے کے ساتھ ساتھ تجریدی افسانے بھی لکھے گئے۔ تجریدی افسانے نے بھی مابعد الطبیعیاتی رنگ اختیار کیا۔ تجرید دراصل الفاظ کی تصوراتی جہتیں ہیں جو گہری علامتوں سے وجود میں آتی ہیں اور جس کے ڈانڈے طبیعات و مابعد الطبیعیات میں یکساں طور پر موجود ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ علامت کا تعلق اسلوب سے اور تجرید کا خیال یا موضوع سے ہوتا ہے۔ تجریدی افسانہ دراصل مصوری کی ایک تکنیک تجریدی مصوری کے تتبع میں لکھا گیا ہے، اس میں موجود ابہام مابعد الطبیعیاتی صورت اختیار کر جاتا ہے۔

افسانہ نگاری کے اس عہد میں موضوع کے ساتھ ساتھ اسالیب میں بھی مابعد الطبیعیاتی رنگ ملتا ہے کیونکہ اس نئے افسانے کے ساتھ نئی لسانی مابعد الطبیعیات بھی اس دور میں سامنے آئیں۔ لسانی مابعد الطبیعیات کا تعلق زبان و بیان کے اظہار کے مختلف طریقوں سے ہے۔ زبان گہرے معانی کی سطح پر تخلیقی اذہان کے لیے ایک طرف تو تفہیم کا ذریعہ ہے اور دوسری جانب یہ خیال و فکر کی ساخت کرتے ہوئے کلچر کی نمو اور فروغ کا فریضہ بھی سرانجام دیتی ہے۔ لسانی مابعد الطبیعیات کے متعلق ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ جہاں شعور کی روشنی ختم ہوتی ہے وہاں لاشعور کی آرکی ٹائپس کے حوالے سے الفاظ کی تہہ داری اور معنویت کے لیے نئے افق طلوع ہوتے ہیں جنھیں ہم لسانی مابعد الطبیعیات

کہتے ہیں۔لسانی مابعدالطبیعیات اورلسانی تشکیلات میں فرانس کے مفکّرین بالخصوص لیوس سٹراس کا بہت بڑاحصّہ ہے اسی لیے لسانی تشکیلات میں نوکلاسیکی اسلوب اوررومانی نظریات کی آمیزش ملتی ہے۔لسانی تشکیلات کی بے شمارصورتیں ہیں مثلاً متھالوجی،لوک کہانیاں،آرکی ٹائپ اورکردار وغیرہ۔نظم میں استعارہ بھی ایک لسانی تشکیل ہے۔اُردوادب میں نئی لسانی تشکیلات کی ابتدا جیلانی کامران کی 'استانزے'،افتخار جالب کی 'ماخذ' کے دیباچوں سے ہوئی۔اس طرح لفظ کی نئی مابعدالطبیعیاتی جہتوں کی نشاندہی ہوئی جس کے زیرِ اثر زبان کے نئے تجربات ہونے لگے۔قواعدوتراکیب اوراضافتوں سے گریز کی شعوری کوشش کی جانے لگی۔پرانے استعاراتی نظام کوامیجز،تمثیل کاری اورپیکر تراشی نے بدل ڈالا۔اس طرح پہلی بارالفاظ کی نئی مابعدالطبیعیاتی سطحیں تخلیقی سطح پرسامنے آئیں۔اس عہد میں نئی نہج اور مابعدالطبیعیاتی طرز پرافسانے لکھنے والوں میں انتظارحسین،انورسجاد،خالدہ حسین،رشیدامجد،احمد جاوید،محمدمنشایاد،مرزاحامد بیگ،اسدمحمد خان،مظہرالاسلام اور دیگرکئی افسانہ نگارشامل ہیں۔

انتظارحسین نے پرانے عہدناموں،انجیل،قصص الانبیا،دیومالا،بودھ جاتکا،پرانوں،داستانوں اورصوفیا کے ملفوظات سے افسانوں میں مابعدالطبیعیاتی جہات پیدا کی ہیں۔ان کے منفردعلامتی نظام،داستانوی پیرایۂ اظہار نے افسانے کے اسالیب میں گراں قدر اضافہ کیا۔انتظارحسین نے اپنے منفرداسلوب اورکہانی پن کی بدولت افسانے کو سننے سنانے کی چیز بنایا۔ان کے افسانے،معاشرتی یادوں، اخلاقی وروحانی زوال،سیاسی وسماجی اور وجودی مسائل کے ساتھ ساتھ نفسیاتی طرز کی کہانیوں پرمشتمل ہیں۔انہوں نے افسانوں کی بنت کاری میں ہندی واسلامی اساطیر،علامت وتجرید،تمثیل وحکایات،قدیم کہانیوں،مذہبی روایات اوراستعاروں سے کام لیا ہے۔انتظار حسین کے افسانوں میں وہ ماورائی کیفیت ملتی ہے جوارضی وسماجی سطحوں سے بلند ہوکر مابعدالطبیعیاتی بلندیوں کوچھونے کی طاقت رکھتی ہے۔ان کے افسانوں 'آخری آدمی'،'زردکتا'،'کایاکلپ'،'سوئیاں'،'ہڈیوں کا ڈھانچ'،'ٹانگیں'،'کانا دجال'،'شرم الحرم'،'کشتی'،''شہرِ افسوس'،'دوسرا گناہ'،'دہلیز'،'سیڑھیاں'،'کٹا ہواڈبہ'،'مردہ آنکھ'،'خواب اور تقدیر'،'خیمے سے دور'،'پتے'،'واپسی'،'کرناری' اور دیگرکئی میں مابعدالطبیعیاتی عناصر ملتے ہیں۔

انورسجاد کے افسانوں میں علامتیت،تجریدیت،باطنیت،اظہاریت،ماورائیت،تہہ داری،دیومالائی حوالے،استعارہ،تمثیل اور اساطیر نے مِل کر مابعدالطبیعیاتی رنگ پیدا کیا ہے۔وہ موضوعات اوران کی پیش کش کے حوالے سے اپنے عہد کے دیگرافسانہ نگاروں سے خاصے مختلف ہیں۔انہوں نے روایتی بیانیہ سے انحراف کرکے نئے ڈکشن کی بنیادڈالی،مصوری،شاعری اور دیگرکئی نئی تکنیکوں کواستعمال کیا اور اردوافسانے کوایک نیااسلوب وآہنگ دیا۔انورسجاد کے افسانوں کے موضوعات زیادہ تر تنہائی،غیریت،بڑے شہروں کی تیز رفتارزندگی کے مسائل،سیاسی جبریت اورفرد کی تنہائی وغیرہ ہیں اس کے علاوہ فلسفہ وجودیت کے اثرات بھی ان کے افسانوں میں واضح طور پر دکھائی دیتے ہیں۔انورسجاد نے پرانی علامتوں کو نئے معانی میں استعمال کیا اورافسانوں میں معانی کی مختلف پرتیں کھولی ہیں۔انھوں نے لسانی تشکیلات کے عمل سے نئی نئی علامتیں استعمال کرکے دوہری معنویت پیدا کی۔انھوں نے لفظیات کی مابعدالطبیعیاتی سطحوں کوبھی افسانوں میں بڑی خوبی سے برتا ہے۔انورسجاد نے پہلی باراردوافسانے کونئی لفظیات،نئی تکنیکوں اورنئی علامتوں سے متعارف کروایا،یہی وجہ ہے کہ ان کی علامتیں ظاہری سطحوں سے ہٹ کر مابعدالطبیعیاتی صورتیں اختیارکرجاتی ہیں۔ان کے افسانے 'کیکر'،'دوب،ہوااورلنجا'،'تلاشی'،'گھیراؤ'،'گائے'،'سنڈریلا' اور 'پرومیتھیس' نے اُردوافسانے میں مابعدالطبیعیاتی عناصر کے حامل افسانوں میں ایک اچھااضافہ کیا ہے۔

خالدہ حسین نے بھی علامتی و تجریدی افسانے لکھے۔ ان کے افسانوں میں خوف، دہشت، اسرار، علامت، تجرید، اساطیر اور تصوف مابعد الطبیعیاتی عناصر کے طور پر نظر آتے ہیں۔ اس کے علاوہ سارتر کے فلسفہ وجودیت کے تحت ذات کی تلاش کا احساس بھی ملتا ہے۔ انھوں نے تلاش ذات، انسانی تنہائی وغیریت جیسے مسائل پر بھی قلم اٹھایا ہے۔ خالدہ نے انسانی وجود کے مادی و مابعد الطبیعیاتی موضوعات کے ساتھ ساتھ تصوف کو بھی اپنا موضوع بنایا، اسی بنا پر صوفیانہ طرز ان کے ہاں نظر آتا ہے۔ ساٹھ کی دہائی میں نظر آنے والے دیگر رجحانات کے ساتھ سریلزم، علامتیت اور لامعنویت کے جو رجحانات در آئے ان کا رنگ بھی خالدہ حسین کے افسانوں پر غالب رہا۔ اسی بنا پر ان کے ہاں خارج اور باطن کے درمیان ایک کشمکش نظر آتی ہے جو انھیں ایک مابعد الطبیعیاتی نظام کی تشکیل کی طرف مائل کرتی ہے۔ خالدہ حسین کے افسانوں 'سواری'، 'ہزار پایہ'، 'آخری سمت'، 'ایک بوند لہو کی'، 'پہچان'، 'ایک رپورتاژ' غیرہ میں مابعد الطبیعیاتی عناصر موجود ہیں۔

رشید امجد نے دنیائے ادب میں اس وقت افسانہ نگاری شروع کی جب ایک طرف تو انور سجاد اپنے افسانوں کی بے معنویت اور لامرکزیت سے مستقبل کو زیر دام لانے کی کوشش کر رہے تھے اور دوسری طرف انتظار حسین حال سے گریزاں ہو کر کتھا اور داستان سے اپنا ناطہ جوڑے ہوئے تھے ایسے میں رشید امجد نے صوفیانہ اور مابعد الطبیعیاتی نوعیت کے افسانے لکھ کر نا صرف ماضی، حال اور مستقبل کو متصل کیا بلکہ اپنے افسانوں کے لیے نئی راہیں بھی متعین کیں۔ رشید امجد نے علامتی و تجریدی افسانہ لکھا مگر اس کے ساتھ ساتھ ان کے افسانوں میں روحانیت، باطنی اسرار و رموز، عالمِ ارواح سے متعلقہ مسائل اور دیگر باطنی علوم سے مابعد الطبیعیاتی رنگ پیدا ہوا ہے۔ رشید امجد کے ہاں ایک باطنی و روحانی سفر کی کیفیت ملتی ہے، ان کے ہاں مرشد کا کردار بھی مابعد الطبیعیاتی نوعیت کا ہے جس کے ذریعے وہ بہت سے گنجلک سوالوں کا حل تلاش کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ وجود کیا ہے؟ کائنات کیا ہے؟ حقیقت کیا ہے؟ یہ اور ان جیسے کئی مابعد الطبیعیاتی سوالات ان کے افسانوں کا موضوع خاص ہیں۔ اساطیر سے رشید امجد کے تخلیقی تعلق کی صورت بھی ملتی ہے۔ ان کے افسانوں کی کئی اسطوری سطحیں بھی ہیں۔ انھوں نے اس سلسلے میں قرآنی قصوں اور مذہبی اساطیر سے بھی کام لیا ہے۔ رشید امجد کے افسانوں 'قطرہ سمندر قطرہ'، 'ہابیل اور قابیل کے درمیان ایک طویل مکالمہ'، 'لا= ؟'، 'ڈوبتی پہچان'، 'سناٹا بولتا ہے'، 'بے چہرہ آدمی'، 'لمحہ جو صدیاں ہوا'، 'دشت خواب'، 'اپنے ہونے کا احساس'، 'جواز'، 'پسلی کا رشتہ'، 'شب مراقبہ کے اعترافات کی کہانیاں'، 'بلیک ہول'، 'بے زمین'، 'بے شناخت'، 'سفر نا سفری'، 'سمندر قطرہ سمندر'، 'شناسائی'، دیوار اور تابوت'، 'سمندر مجھے بلاتا ہے' اور دیگر کئی میں مابعد الطبیعیاتی لہریں موجود ہیں۔

احمد جاوید نے اپنے منفرد استعاراتی اسلوب، تہہ دار علامتی نظام اور لفظ کی الوہی و مابعد الطبیعیاتی سطحوں کو اردو افسانے میں نئے رنگ سے برتا ہے۔ وہ اساطیر، حکایات، تمثیل اور علامتوں سے ایک ایسا مابعد الطبیعیاتی نظام تشکیل کرتے ہیں جو معانی و مفاہیم کی کئی پرتیں وا کرتا ہے۔ انھوں نے فرد، سماج اور کائنات کے مسائل کو اپنا موضوع بنایا اور عصری صورت حال کا ادارک کرتے ہوئے اظہار پر لگائی گئی قدغن کو زبان و بیان کے نئے قالب میں ڈھالا۔ انھوں نے فلسفۂ وجودیت کے تحت انسان کے وجود کی شناخت کو معاشرتی اور آفاقی سطحوں پر تلاش کیا اور زمان و مکاں کی قیود سے بالاتر ہو کر وقت اور زمانے کے آفاقی پہلوؤں کو اجاگر کیا۔ احمد جاوید کے ہاں انسانی، تہذیب اور ماضی کی بازیافت کا وہ سلسلہ ملتا ہے جو آگے چل کر مذہبی، تاریخی اور لسانی علامتوں کی صورت اختیار کر گیا ہے۔ احمد جاوید نے اردو افسانے میں فیبل کہانیوں کی طرز کے افسانے لکھے ہیں جن میں بیان و اظہار کے لیے کہیں جانوروں، کہیں کیڑے مکوڑوں اور کہیں حشرات الارض کو بطور کردار پیش کیا ہے۔ احمد جاوید کا یہ مخصوص انداز صرف انہی کے ساتھ منسوب ہے۔ احمد جاوید کے افسانوں 'پیادے'، 'کولہو کے بیل'، 'گشت پر نکلا ہوا سپاہی'، 'آکاش

بیل‘، ’آثار‘، ’غیر علامتی کہانی نمبر۲‘، ’چڑیا گھر‘، ’گمشدہ شہر کی داستان‘، ’شام اور پرندے‘، ’گمشدہ آسمان‘، ’اندر والی آنکھ‘، ’بند آنکھوں کے پیچھے‘، ’باہر والی آنکھ‘، ’کبوتر‘، ’چڑیا‘، ’کانچ کا شہر‘، ’شیشے کی گلیاں‘ اور دیگر کئی میں مابعد الطبیعیاتی عناصر موجود ہیں۔

منشا یاد نے بھی علامت، تجرید اور لفظ کی الوہی جہتوں سے افسانوں میں مابعد الطبیعیاتی رنگ پیدا کیا ہے۔ انھوں نے ظاہر سے زیادہ باطن پر توجہ دی جو علامتی، تجریدی اور صوفیانہ انداز میں ان کے افسانوں کی پہچان بنا۔ ان کے افسانوں ’اوور ٹائم‘، ’دوپہر اور جگنو‘، ’بتیال کتھا‘، ’ریت اور پانی‘، ’سورج کے زخم‘، ’بند مٹھی میں جگنو‘، ’دام شنیدن‘، ’سورج کی تلاش‘ میں مابعد الطبیعیاتی رنگ نمایاں ہے۔

مرزا حامد بیگ کے افسانوں میں بھی مابعد الطبیعیاتی لہریں رقص کرتی ہیں۔ انھوں نے علامتیت، پراسراریت، ماضی کے واقعات، اسرار و رموز، تحیّر و تجسّس، مافوق الفطرت واقعات اور لفظیات کے منتر سے مابعد الطبیعیاتی عناصر کو بڑے خوب صورت اور دلکش انداز میں افسانوں میں پیش کیا۔ اس ضمن میں مرزا حامد بیگ کے افسانوں کی داستانوی اور طلسماتی فضا اہم ہے جو ان کی کہانیوں میں ایک نیا رنگ و آہنگ پیدا کرتی ہے۔ ان کے افسانے ’زمین جاگتی ہے‘، ’برج عقرب‘، ’نیند میں چلنے والا لڑکا‘، ’آخر گت‘، ’سرسوتی اور راج ہنس‘، ’گناہ کی مزدوری‘ مابعد الطبیعیاتی عناصر کے حوالے سے اردو ادب میں ایک اچھا اضافہ ہیں۔

اسد محمد خان کے ہاں علامت، استعارہ، تمثال، تاریخی تلمیحات، اساطیر اور داستانوی انداز کی آمیزش سے افسانوں میں مابعد الطبیعیاتی رنگ پیدا ہوا ہے۔ انھوں نے تاریخی تلمیحات کو جدید عصری مسائل کے تناظر میں پیش کیا۔ انھوں نے اپنا تخلیقی تعلق اساطیر سے بھی جوڑا اور گہری علامتوں سے نئے معانی پیدا کیے اور ماضی کی بڑی روایات کا مقابلہ عصرِ حاضر سے کیا۔ ان کے مابعد الطبیعیاتی رنگ کے حامل افسانوں میں ’باسودے کی مریم‘، ’مئی دادا‘، ’یوم کپور‘، ’ترلوچن‘، ’برادو! برادو‘ اور ’سارنگ‘ وغیرہ اہم ہیں۔

اب تک ہم نے ان افسانہ نگاروں کا ذکر کیا ہے جنھوں نے مابعد الطبیعیاتی عناصر کو تواتر کے ساتھ اپنے افسانوں میں برتا ہے۔ عہدِ حاضر میں دیگر کئی افسانہ نگار ایسے ہیں جن کے افسانوں میں مابعد الطبیعیاتی عناصر کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ ان میں سمیع آہوجہ، مسعود اشعر، اعجاز راہی، زاہدہ حنا، احمد داؤد، مظہر الاسلام، سلیم آغا قزلباش، آصف فرخی، انوار احمد، عزیز احمد، محمد خالد اختر، اعجاز احمد فاروقی، ابدال بیلا، جمیل احمد عدیل، احمد ہمیش، آغا سہیل، عرش صدیقی، فہیم اعظمی، عذرا اصغر، سائرہ ہاشمی، منیر احمد شیخ، سلطان جمیل نسیم، محمود احمد قاضی، طارق محمود، یوسف چودھری، شعیب خالق، ناصر بغدادی، انور زاہدی، علی حیدر ملک، محمود واجد، اے خیام، مبین مرزا، محمد حمید شاہد، محمود سعید شیخ، جاوید اختر، آغا گل، امراؤ طارق، شہزاد منظر، یونس جاوید، وقار بن الٰہی، اکرام اللہ، رضیہ فصیح، فرخندہ لودھی، مسعود مفتی وغیرہ شامل ہیں۔

حواشی و حوالہ جات

۱۔ فردوس انور قاضی، ڈاکٹر، اردو افسانہ نگاری کے رجحانات، مکتبہ عالیہ، لاہور، ۱۹۹۰ء، ص ۴۶

۲۔ شفیق انجم، ڈاکٹر، اردو افسانہ، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۰۸ء، ص ۲۰۶

کتابیات

۱۔ شفیق انجم، ڈاکٹر، اردو افسانہ، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۰۸ء

۲۔ فردوس انور قاضی، ڈاکٹر، اردو افسانہ نگاری کے رجحانات، مکتبہ عالیہ، لاہور، ۱۹۹۰ء